تعلیم البیان

(اندازِ تقریر)

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۷	تمہید	۱
۸	اہمیتِ دعا	۲
۹	تین بڑی رحمتیں	۳
۹	نعمتوں کے ذکر میں ترتیب	۴
۱۰	قابلِ اعتبار تقریر	۵
۱۱	بیان میں تعلیماتِ قرآن سے بے پرواہی	۶
۱۱	تقریر کی خوبی	۷
۱۳	علماء اہلِ حق اور اسکالرز کی تقاریر میں فرق	۸
۱۴	ایک اعتراض کا جواب	۹
۱۴	اتباعِ نبوی ﷺ کی روح	۱۰
۱۵	''اُمِیَّۃٌ'' کا اصلی مفہوم اور بیان کی خوبی	۱۱

۱۲	زبان کی خوبی	۱۵
۱۳	ہماری اصلی زبان	۱۶
۱۴	اپنی زبان کی حفاظت میں کوتاہی	۱۶
۱۵	اُردو زبان کا آغاز	۱۷
۱۶	تیجے کی رسم کے آغاز کی وجہ	۱۷
۱۷	قابلِ افسوس بات	۱۸
۱۸	تقریر میں قابلِ اہتمام بات	۲۰
۱۹	حدیث قرآن کا بیان	۲۰
۲۰	شجرکاری کے فوائد	۲۱
۲۱	عجیب وغریب قوت حافظہ	۲۲
۲۲	مجتہدین کے اجتہاد کا مرتبہ	۲۳
۲۴	نعمتِ عظمیٰ	۲۴
۲۵	تقریر و وعظ کی اہمیت	۲۴
۲۶	تدریس، تقریر اور تحریر سکھانے کا طریقہ	۲۵
۲۷	تدریس کا بہترین انداز	۲۶
۲۸	حضرت تھانویؒ کا انداز تدریس	۲۸
۲۹	تقریر کا بہترین طریقہ	۲۸

۳۰	وعظ کا نام	۲۹
۳۱	نام رکھنے میں احتیاط کی ضرورت	۲۹
۳۲	طرزِ جدید کا نقصان	۲۹
۳۳	تقریر میں بے باکی ناپسندیدہ ہے	۳۰

سالک مقامِ ناز میں عرفان کا یقین
ملتا ہے جب کہ دل ہو بس اک یار کا امین
معیار حال و قال ہو عبدیت وفنا
اِیــــَّاكَ نَـعۡبُـدُ ہواور اِیَّـــاكَ نَسۡتَـعِیۡـن

حضرت مولانا مشرف علی تھانوی دامت برکاتہم
شیخ الحدیث ومہتمم جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ لاہور

وعظ

تعلیم البیان

(اندازِ تقریر)

۱۱/ رجب ۱۳۳۰ھ کو مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون کے طلباء نے تقریر کی مجلس کا اہتمام فرمایا جس کے افتتاح کے موقع پر حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کھڑے ہوکر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔

سامعین کی تعداد تقریباً ۳۵ تھی جن میں اکثریت طلباء کی تھی۔

مولانا سعید احمد صاحب تھانویؒ نے اسے قلمبند فرمایا۔

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارک وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرّجیم بسم اللّٰہ الرّحمن الرّحیم

تمہید

یہ معلوم ہے کہ اس وقت ایک خاص مبارک مجلس کا افتتاح ہے جس کی غرض صرف یہ ہے کہ طلباء کو بیان کرنے کی عادت ڈالی جائے تا کہ وہ غایت علم (۲) میں قاصر نہ رہیں اور ان کا پڑھا لکھا ان ہی تک محدود نہ رہے دوسروں کو بھی پہنچا سکیں اور اسی کے متعلق بیان کرنے کی غرض سے اس وقت یہ آیت تلاوت کی گئی ہے میں نے اپنے بیان کے لئے پہلے سے یہی آیت تجویز کی تھی مگر حسنِ اتفاق سے قاری صاحب (۳) نے بھی یہی رکوع سنایا۔ قاری صاحب کے شروع کرتے ہی مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ توافق تجویزوں (۴) کا ان شاء اللہ اس مجلس کے مقبول ہونے کی علامت ہے حدیث شریف میں شب قدر کی بابت (۵) ارشاد ہے کہ چونکہ چند

---

(۱) ''رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی اس نے انسان کو پیدا کیا' اسی نے انسان کو بولنا سکھایا'' سورۂ رحمٰن: ۱ تا ۴) (۲) علم حاصل کرنے کے اصل مقصد میں (۳) اول قاری محمد یامین صاحب نے تبرکاً ایک رکوع پڑھا تھا وہ یہی تھا (۴) قاری صاحب کا تلاوت کے لئے اس رکوع کا انتخاب اور حضرت کا بیان کے لئے اس آیت کا انتخاب دونوں کا متفق ہونا (۵) متعلق۔

خواب متفق ہیں کہ اس عشرے میں شب قدر (۱) ہے اس لئے گمان غالب اسی کے موافق ہے اس سے عرفاء نے یہ بھی استنباط (۲) کیا ہے کہ چند قلوب کا واردات پر مجتمع ہو جانا دلیل ظنی اس وارد کے صحیح ہونے کی ہوتی ہے (۳) اور ہر چند کہ ہم کیا اور ہمارے واردات کیا لیکن چھوٹی باتوں میں چھوٹے واردات کا بھی ہم وہی اثر کہیں گے جو کہ بڑی باتوں میں بڑے واردات کا اثر ہوتا ہے۔

تو اس وقت میرے اور قاری صاحب کے دل میں یہ آنا کہ اس آیت کی تلاوت کی جائے اور ظاہر ہے کہ ہم دونوں میں کم از کم بحمد اللہ اسلام تو ضرور ہے اور ہماری مجلس چھوٹی ہی سی مجلس ہے قرینہ (۴) اس کا ہے کہ یہ مجلس ان شاء اللہ لا طائل نہیں (۵) ہے بلکہ امید ہے کہ مقبول ہوگی لیکن صرف اس قرینہ پر اکتفا و اعتماد نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس کی مقبولیت کے لئے تدبیر بھی کی جائے جو کہ اتباعِ سنت ہے اور اس کے ساتھ دُعا بھی کرنی چاہیئے جو کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ختم بیان پر ہوگی۔

اہمیتِ دعا

دُعا میں یہ بھی ہونا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ اس کو باثمر (۶) کریں اور اس میں سنتِ نبویہ ﷺ کی موافقت ہو اور حدود و شریعت سے متجاوز نہ ہو۔ بڑی چیز ہر امر میں دُعا ہے باقی سب دل خوش کن قرائن درجہ فال میں ہیں جو کہ مبشر ہوتی ہیں (۷) اور سب سے ادنیٰ درجہ بشارت کا ہوتا ہے اور اس کے بعد تدبیر کا مرتبہ ہے اور سب سے اعلیٰ مرتبہ دعا کا ہے جو تدبیر کے ساتھ ہو۔ گویا ہر امر میں کامیابی کے لئے علت تامہ کا جزو اخیر دُعا ہے سو دُعا کو بھی جلبِ (۸) منفعت میں بہت بڑا دخل ہے۔ یہ جملہ

(۱) آخری عشرہ رمضان میں (۲) عارفین نے یہ مسئلہ سمجھا ہے (۳) چند نیک لوگوں کے دل میں ایک ہی بات کا خیال آنا اس کے صحیح ہونے کی دلیل ہے (۴) اس کی دلیل ہے (۵) بیکار نہیں (۶) بار آور (۷) نیک فال کے درجے میں ہیں جو باعث خوشی ہوتیں ہیں (۸) فائدہ و نفع کے حاصل ہونے میں۔

معترضہ تھا' اب میں مقصود عرض کرتا ہوں۔

تین بڑی رحمتیں

حق سبحانہ تعالیٰ نے ان چھوٹی سی آیتوں میں اپنے خاص افعال کا ذکر فرمایا ہے کہ جو سراسر رحمت ہیں اور پھر اپنے اسم مبارک کو بھی عنوان رحمت ہی سے ذکر فرمایا اور اس آیت میں تین رحمتوں کا ذکر ہے اور تینوں بڑی رحمتیں ہیں اور ہر ایک کو الرّحمٰن ہی سے شروع کیا ہے کیونکہ الرّحمٰن مبتداء ہے اور اس کے بعد خبریں تو گویا عبارت یوں ہے ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ اَلرَّحْمٰنُ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○﴾ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تینوں نعمتوں کا منشاء خدا تعالیٰ کی رحمت ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی حاکم کسی سے کہے کہ مہربان حاکم نے تم کو عہدہ دیا مہربان حاکم نے تمہاری ترقی کی مہربان حاکم نے تم کو افسر بنایا۔ اس سے ہر اہل زبان سمجھ سکتا ہے کہ منشاء ان تمام عنایتوں کا مہربان ہے پس اسی طرح ان سب نعمتوں کا منشاء بھی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے اور پھر رحمت بھی عظیمہ کیونکہ رحمٰن مبالغہ کا صیغہ ہے تو ترجمہ کا حاصل یہ ہوا کہ جس ذات کی بڑی رحمت ہے اس نے قرآن کی تعلیم دی یہ تو پہلی نعمت کا بیان ہے دوسری نعمت یہ کہ اس نے انسان کو پیدا کیا اور تیسری نعمت یہ کہ اس نے انسان کو بیان کرنا سکھلایا۔

نعمتوں کے ذکر میں ترتیب

ان تینوں نعمتوں میں اس وقت کی غرض کے مناسب تیسرا جملہ ہے مگر چونکہ ان دو نعمتوں کی تقدیم (۱) جس طرح ذکر میں ہے اسی طرح وہ دونوں وجود میں بھی اس تیسری نعمت پر مقدم ہیں (۲) خواہ وجودِ حسی ہو یا وجودِ معنوی' اس لئے

(۱) دو نعمتوں کو پہلے ذکر کرنا (۲) وجود کے اعتبار سے بھی اس تیسری نعمت سے پہلے ہیں۔

ان دو جملوں کی بھی تلاوت کی گئی چنانچہ ایک مقام کا تقدم اور دخل تو ظاہر ہے۔ یعنی ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ﴾ کہ اس کو تو تکویناً دخل ہے اور یہ شرط تکوینی ہے کیونکہ جب تک انسان پیدا نہ ہو اس وقت تک تعظیم بیان ہو ہی نہیں سکتی تو تعلیم و تعلم موقوف ہے وجود پر(۱) اور وجود موقوف ہے ایجاد پر اور اسی سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذکر کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ یہ سب جانتے ہیں کہ اگر پیدا نہ ہوتے تو بیان نہ کرسکتے۔ لیکن اس کے مستقلاً ذکر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ اس پر متنبّہ فرمانا ہے کہ جو نعمت کسی دوسری نعمت کا وسیلہ ہو وہ ایک درجے میں مستقل اور مقصود بھی ہے اس کو محض واسطہ ہی نہ سمجھا جائے یعنی بعض نعمتیں چونکہ وسیلہ ہوتی ہیں اس واسطے ان کی طرف اکثر توجہ نہیں ہوا کرتی اس لئے مستقلاً ذکر کرنے سے گویا یہ ارشاد فرمادیا کہ یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے اور یہ بھی قابل مستقل ذکر اور توجہ کے ہے صرف ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ (۲) ہی نعمت نہیں پس اگر یہ نعمتِ تکوین مذکور نہ ہوتی تو اس کی مقصودیت پر لفظاً تنبیہ نہ ہوتی اور ذکر کرنے میں تنبیہ ہوگئی کہ یہ بھی مستقلاً نعمت ہے اور ظاہر یہی ہے کیونکہ پیدا کرنا صرف واسطۂ تعلیم بیان ہی نہیں بلکہ اس میں اور بھی تو مصالح ہیں۔ بہرحال اس پر تو توقف تکوینی ہے اور بہت ظاہر ہے۔

قابلِ اعتبار تقریر

دوسری شرط کا تقدم وہ بہت غامض (۳) ہے حتی کہ اہل علم بھی بعض اوقات اس کی طرف التفات نہیں کرتے اور وہ شرط ﴿عَلَّمَ الْقُرْآنَ﴾ ہے کہ اس پر توقف تشریعی ہے یعنی بیان کا وجود اگرچہ بدون قرآن کے حسّاً ہوگیا لیکن وجود صحیح قابل اعتبار تعلیم قرآن کے بعد ہوگا کیونکہ اگر بیان میں تعلیمات قرآنیہ کا لحاظ نہیں

(۱) پڑھنا پڑھانا بغیر وجود کے نہیں ہوسکتا (۲) اس نے ان کو بولنا سکھایا (۳) بہت گہرا ہے۔

تو وہ بیان اور تقریر شرعاً باطل اور کالعدم (۱) ہے جیسا آج کل اکثروں نے قرآن کی تعلیم کو بالکل ترک کر دیا ہے۔

تعلیماتِ قرآن سے بے پرواہی

عوام الناس کو تو بہت ہی دیکھتے ہیں کہ وہ اکثر امور میں حدودِ شرعیہ سے متجاوز (۲) ہوگئے ہیں اور ان کی ذرا رعایت نہیں کرتے مگر ہم اسی طرح طلباء کو بھی اپنے اقوال و افعال میں جادۂ شریعت (۳) سے بہت زیادہ بڑھا ہوا پاتے ہیں اور قرآن کی تعلیم کو انہوں نے بھی بہت زیادہ چھوڑ دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل تحقیق طلباء کو ایسے جلسوں اور انجمنوں کی اجازت دیتے ہوئے کھٹکتے ہیں کیونکہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ جلسوں کی کارروائی میں متجاوز عن الشرع نہ ہو جائیں۔ (۴)

تقریر کی خوبی

چنانچہ میں اس وقت بعض نوجوان عربی طلباء کو بھی دیکھتا ہوں کہ وہ ان مجالس میں بھی شریعت کی بہت سی باتیں چھوڑ جاتے ہیں چنانچہ کبھی خلافِ تحقیق مضامین بیان کرتے ہیں کہیں طرز بیان مقلدان یورپ کا اختیار کرتے ہیں اور ستم یہ ہے کہ ان کے بزرگ واساتذہ بھی ان کو اس طرز سے نہیں روکتے بلکہ ان کے سرمایۂ تقریر میں اس کو معین (۵) اور قوت پیدا کرنے والا سمجھا جاتا ہے' اور سبب اس کا یہ ہے کہ علم کی تو کمی ہوگئی ہے اس لئے تلمیع (۶) کی ضرورت پڑتی ہے چونکہ کھری چیز پاس نہیں ہے اور جس کے پاس کھری چیز ہوگی اس کو تلمیع کی ضرورت کیوں ہوگی؟ پس اس کی غیر ملمع تقریر گو لفظی آب و تاب نہ رکھے مگر اس میں حسن باطنی ہوتا ہے

(۱) بے کار اور نہ ہونے کے برابر ہے (۲) حدود شرعی سے باہر نکل جاتے ہیں (۳) شریعت کی حد سے باہر دیکھتے ہیں (۴) شرعی حدود سے آگے نہ بڑھ جائیں (۵) مددگار (۶) بناوٹی باتیں شامل کرنے کی۔

اور ملمع تقریر میں گو آب و تاب ظاہری ہوتی ہے مگر تدبر و تفکر کے بعد وہ تمام رنگ اتر کر الفاظ ہی الفاظ رہ جاتے ہیں پس تفکر و تامل سے دونوں کا امتحان ہو جاتا ہے اسی مضمون کو حافظ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

خوش بود گر محکِ تجربہ آید بمیاں　　　تا سیہ رو بشود ہر کہ دروغش باشد

یعنی بہتر یہ ہے کہ مجھے اور حریف (۱) کو تجربہ کی کسوٹی پر کس لیا جائے جس میں غش (۲) ہوگا وہ سیہ رو ہو جائیگا کیونکہ اس میں اگرچہ آب و تاب ہے لیکن کسوٹی (۳) کے پاس جا کر سب مٹ جائیگی اور جو کھرا ہے وہ وہاں بھی اسی آب و تاب کے ساتھ رہیگا بلکہ اور دونی رونق بڑھ جائیگی۔

غرض جن کے پاس علمی سرمایہ ہے ان کو کسی قسم کی تلمیع کی ضرورت نہیں اور جن کے پاس یہ نہیں وہ ہر طرح تلمیع سے کام لیتے ہیں اور پھر بھی وہ حُسن پیدا نہیں ہوتا اسی حُسن کو حافظ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

حسد چہ می بری اے سُست نظم بر حافظ　　　قبول خاطر و حسنِ سخن خداداد ست

''حاسدو! حافظ کی نظم پر تم حسد کیوں کرتے ہو کلام کی اچھائی اور اس کا قبول خاطر ہونا خداداد ہے''

اور ؎

دلفریبانِ نباتی ہمہ زیور بستند　　　دلبر ماست کہ باحسنِ خداداد آمد

''نباتات اور پودوں کی دلفریبیاں دل لبھارہی ہیں مگر میرا محبوب جب اپنے حسنِ خداداد سے جلوہ آرا ہوا تو اس کے سامنے دل تمام فریبیاں اور رنگینیاں مات ہیں''

---

(۱) دشمن (۲) جس میں کھوٹ ہوگا وہ شرمندہ ہو جائے گا (۳) کسوٹی اس پتھر کو کہتے ہیں جس پر رگڑ کر سونے کا خالص ہونا معلوم کیا جاتا ہے۔

ہم نے حضرات اہلِ حق کو دیکھا ہے کہ ان کے سادہ الفاظ میں وہ خوبی اور دلچسپی ہوتی ہے کہ بڑے بڑے استعاروں میں نہیں ہوتی۔ یہ جتنی شستہ اور چست تقریریں کہلاتی ہیں ان کی خوبی محض نظر اول ہی تک ہے اور جس قدر زیادہ غور کرتے جایئے ان کا پوچ اور لچر اور محض مجموعۂ الفاظ ہونا ظاہر ہوتا جاتا ہے کیونکہ وہاں سرمایۂ علم نہیں ہوتا۔ برخلاف اہل علم کے کہ ان کے سادہ الفاظ کی یہ حالت ہے کہ
''يزيدك وجهه حسنا اذا ما زدته نظراً''(۱)

علماء اہلِ حق اور اسکالرز کی تقاریر میں فرق

مجھے ایک انسپکٹر ڈاکخانہ جات ملے وہ طالبِ حق تھے اور طلبِ حق کا خاصہ ہے کہ اس میں حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے وہ ایک صاحب کی بابت کہ وہ اس دنیا میں جس کو آجکل اخیاری دنیا کہا جاتا ہے بہت مشہور ہیں کہتے تھے کہ مجھے ان کی معیت(۲) میں رہنے کا اور تقریر سننے کا اتفاق ہوا ہے اور میں ان کی تقریریں سن کر سمجھا کرتا تھا کہ ان کے برابر کوئی محقق نہیں لیکن جب سے میں نے اہلِ حق کی تقاریر سنیں کہ جن کو نہ لیکچر دینا آتا ہے نہ وہ بڑے بڑے الفاظ بولتے ہیں اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اصل علم کیا چیز ہے اور کہتے تھے کہ غور کر کے اہلِ حق کی اور جدید طرز کے لوگوں کی تقریر میں جو فرق میں نے سمجھا وہ یہ ہے کہ جدید طرز کی تقریریں پہلی نظر میں تو نہایت دقیق اور موثر ہوتی ہیں اور حق اُنھیں میں منحصر معلوم ہوتا ہے لیکن جب ان میں غور کیا جائے تو ان کی حقیقت کھلتی جاتی ہے اور ان کا لچر(۳) اور کمزور اور خلاف واقع ہونا اور پُر تلمیع(۴) ہونا معلوم ہوتا جاتا ہے اور اہلِ حق کی تقریر

(۱)''میرے محبوب کو تم جس قدر دیکھو گے اسی قدر اس کا حسین ہونا تمہاری نظر میں بڑھتا چلا جائے گا''

(۲)ان کے ساتھ رہنے کا بہت اتفاق ہوا (۳) ناقابل اعتبار (۴) لفاظی سے پُر ہونا۔

نظر اول میں بے رنگ اور پھیکی معلوم ہوتی ہیں لیکن جتنا ان میں غور کیا جائے تو ان کی قوت اور مطابق واقع ہونا معلوم ہوتا جاتا ہے اور قلب پر نہایت گہرا اثر ان کا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے تمام تلمیعات قلب سے ڈھل جاتی ہیں۔

ایک اعتراض کا جواب

یہاں سے اس اعتراض کا جواب بھی نکل آیا جو آجکل کے علماء پر منجملہ دوسرے اعتراض کے وہ بھی کیا جاتا ہے کہ ان کو لیکچر دینا نہیں آتا۔

وہ جواب یہ ہے کہ جب ہمارے پاس قرآن و حدیث ہے اور اس کی تعلیمات کا سرمایہ موجود ہے تو ہم کو کسی ظاہری آب و تاب کی کیا ضرورت ہے؟ خوب کہا ہے ؎

زعشقِ ناتمامِ ما جمالِ یار مستغنی ست
بآب ورنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا(۱)

ہمیں لیکچروں کا طرز سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں اور ہم تو صاف کہتے ہیں کہ جو شخص لیکچر کے طرز کو اختیار کرتا ہے وہ اول ہمارے دل میں ناپسندیدگی کا بیج بوتا ہے ہم کو تو وہی طرز پسند ہے جس کی طرف حدیث شریف میں اشارہ ہے کہ ((نَحنُ اُمَّةٌ اُمِّیَةٌ)) اُمِیَّةٌ کے معنی سادگی کے ہیں۔

اتباعِ نبوی ﷺ کی روح

تو حضور ﷺ کی اصل مرضی یہ ہے کہ آپ کی امت نہایت سادہ رہے اسی لئے آپ نے لفظ ((نَحنُ)) فرما کر ساری امت کو شامل فرمالیا' یہی روح ہے اتباع نبوی ﷺ

(۱) ''دوست کا جمال ہمارے ناتمام عشق سے مستغنی ہے اس لئے کہ جو چہرہ فی نفسہٖ حسین ہو اسے خالی خواہ مخواہ زیبائش کی کیا ضرورت ہے''

کی کہ ہر بات میں بالکل سادگی ہو اُمِیَّۃٌ اُم کی طرف منسوب ہے مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی ایسی رہے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد بچے کی زندگی ہوتی ہے کہ اس کی کوئی حرکت بھی تصنع اور بناوٹ کی نہیں ہوتی بلکہ ہر حرکت میں بے ساختگی ہوتی ہے اور بچوں کی بھی یہی صفت ہے جس کی وجہ سے ہر شخص کو ان سے محبت ہوتی ہے ورنہ طبعاً بچوں سے جو کہ نجاست کی پوٹ ہوتے ہیں بہت نفرت ہونی چاہیئے تھی اور یہی بے ساختگی ہے کہ جن بوڑھوں میں یہ پائی جاتی ہے آج ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے حسین ان پر جان فدا کرتے ہیں۔

''اُمِّیَّۃٌ'' کا اصلی مفہوم اور بیان کی خوبی

تو اصلی مفہوم اُمیّت کا یہی بے ساختگی ہے اور نہ لکھنا پڑھنا جو اُمیّت کا مشہور مفہوم ہے یہ بھی اس کا ایک شعبہ ہے تو بیان میں بھی بناوٹ اور تکلف بالکل نہ ہونا چاہیئے اور تلبیس اور تلمیع سے بالکل پاک ہونا چاہیئے البتہ بیان میں سادگی کے ساتھ ساتھ صفائی ہونی ضروری ہے لیکن اب یہ طرز بالکل چھوٹتا جاتا ہے۔

زبان کی خوبی

ہم اہلِ علم کو دیکھتے ہیں کہ ان میں ایک تو رواج زبان کا طرز آتا جاتا ہے۔ حالانکہ قطع نظر شریعت کے یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ہماری مادری زبان اردو ہے اور اس کی کچھ خصوصیات ہیں جیسا کہ ہر زبان کے لئے کچھ خصوصیات ہوا کرتی ہیں اب اس طرزِ جدید کو اختیار کر کے انگریزی کی خصوصیات کو زبانِ اردو میں لے لیا گیا ہے اور وہ روز بروز زیادتی کے ساتھ آتی جاتی ہیں حالانکہ انگریزی کی خصوصیات اس میں بالکل نہیں کھپتیں ان کی بدولت زبان بالکل بھدی اور خراب

ہوتی جاتی ہے ایسے لوگوں میں اس وقت ایک بڑی جماعت اپنے کو اردو کا حامی کہتی ہے حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ لوگ اردو کے ماحی (۱) ہیں کیونکہ ہر زبان میں ایک مادہ ہوتا ہے اور ایک ہیئت۔ اور زبان ان دونوں کے مجموعے کا نام ہوتا ہے نہ کہ صرف مادہ کا۔ تو جب زبان اردو کی ہیئت باقی نہ رہیگی تو وہ زبان اردو کیونکر رہے گی پس اگر ہم اردو کے حامی ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ ہم اس کی خصوصیات کو باقی رکھیں اور ہماری گفتگو ایسی ہو کہ اگر کوئی اجنبی سنے تو یہ سمجھے کہ ہم ایک حرف بھی انگریزی کا نہیں جانتے اور نہ انگریزی طرز سے ہم کو مناسبت ہے۔

ہماری اصلی زبان

اور اس سے بھی بڑا تعجب یہ ہے کہ اس وقت عربی خواں طلباء کی تقریروں میں کثرت سے انگریزی الفاظ آنے لگے ہیں حالانکہ ان کی تقریر میں اگر دوسری زبان کے الفاظ آتے تو عربی کے الفاظ آتے کیونکہ اول تو یہ لوگ عربی زبان کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے عربی ہماری مذہبی زبان ہے اور اس اعتبار سے ان کی اصلی زبان وہی ہے اور اردو زبان تو بہت تھوڑے دنوں سے ہماری زبان ہوئی ہے ورنہ ہماری اصلی اور پدری زبان عربی ہی ہے کیونکہ ہمارے آباء و اجداد عرب ہی سے آئے ہیں اور ہندوستان میں بود و باش (۲) اختیار کر لی ہے۔

اپنی زبان کی حفاظت میں کوتاہی

مجھے اکثر اس کا افسوس ہوا کرتا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے اپنے نسب نامہ تک کو محفوظ رکھا لیکن زبان کی حفاظت نہ کی حالانکہ ان حضرات کے لئے یہ کوئی

---

(۱) اردو کو مٹانے والے (۲) ہندوستان میں رہن سہن اختیار کر لیا۔

مشکل بات نہ تھی ۔صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جہاں جہاں فتوحات حاصل کیں ہیں اکثر ملک بھرنے ان کی زبان اختیار کرلی اور آج تک وہی زبان چلی جاتی ہے حالانکہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کا کوئی اہتمام بھی نہ کیا ہوگا مثلاً مصر ہی کو دیکھا جائے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بدولت تمام مصر کی زبان عربی ہے اگرچہ تمام مصر کا مذہب اسلام نہیں خیر اگر صحابہ کی سی برکت غیر صحابہ میں نہیں تھی اور اس لئے تمام مفتوح قوم نے ان کی زبان نہیں لی مگر کم از کم یہ تو اپنی زبان سنبھالتے لیکن تعجب ہے کہ ہندوستان میں آکر ہمارے ان بزرگوں نے اپنی زبان کو رواج دینا کجا سنبھالا بھی نہیں۔

اُردو زبان کا آغاز

غور کرنے سے اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ہمارے بزرگ اکثر جریدہ (۱) تشریف لائے ہیں اور یہیں بود و باش اختیار کر کے یہیں کی نومسلم عورتوں سے نکاح کئے ہیں اس لئے اولاد پر زیادہ اثر ماں ہی کی زبان کا پڑا۔

تیجے کی رسم کے آغاز کی وجہ

اور یہی مادری اثر ہے کہ جس کی وجہ سے مسلمانوں میں آج تک تیجے وغیرہ کی رسمیں باقی ہیں۔یعنی چونکہ ہندی عورتوں میں اپنے آباء واجداد کی رسوم باقی تھیں اس لئے جب وہ ایام آئے ہوں گے تو انہوں نے کہا ہوگا کہ ہم ایسے موقع پر یوں کیا کرتے ہیں۔ان حضرات نے بظاہر کوئی خرابی نہ دیکھ کر محض دلجوئی کے لئے تھوڑا سا تغیر کر کے مثلاً بجائے اشلوک کے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا و مثل ذلک اجازت دیدی ہوگی لیکن اس وقت یہ محض عارضی طور پر تھا اب لوگ اس کو فرض عین سمجھنے لگے اور اس لئے علماء نے منع کیا تو ان کو وہابی اور کیا کیا کہنے لگے۔غرض اسی عارضی

(۱) اکیلے اکیلے آئے۔

مادری اثر کی بدولت ہندوستان میں عربی بھی نہ چل سکی کیونکہ ابا جان تو عربی بولتے ہونگے اور اماں جان ہندی اور بچہ زیادہ تر ماں ہی کے پاس رہتا ہے اس لئے کچھ عربی اور کچھ ہندی مل کر ایک مجموعہ ہوگیا اور اگر گھر میں عربی ہوتی اور باہر آکر لوگوں سے ہندی سنتے تو دونوں زبانیں باقی رہتیں چنانچہ ہم بنگالیوں اور انگریزوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی زبان بھی بولتے ہیں اور اردو بھی بولتے ہیں وجہ یہی ہے کہ اُن کے گھروں میں وہی بنگلہ اور انگریزی بولی جاتی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے چونکہ اس کا اہتمام نہیں کیا یا ہو نہ سکا اس لئے ہماری زبان مرکب ہوگئی، مرکب ہونے پر یاد آیا مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے کہ میں نے مکہ معظّمہ میں ایک ہندی عربی مرکب بچے کو دیکھا کہ رورہا تھا کہ اَنَا بازار جاؤں (۱) غرض ماں کی ہندیت نے زبان کی عربیت کو ضائع کیا اور اصلی زبان برباد ہوئی۔ اور اگر کوئی کہے ہم تو مادری زبان کو اصل سمجھتے ہیں تو میں کہوں گا کہ جب نسب باپ سے ہے تو کیوں باپ کی زبان کو اپنی اصلی زبان نہ کہا جائے۔ غرض ہماری اصلی زبان عربی ہے۔

قابلِ افسوس بات

تو اگر ہم کو اُردو میں آمیزش ہی کرنا تھا تو اس بناء پر زیادہ سے زیادہ ہم یہ کرتے کہ اردو زبان کو عربی کے تابع کردیتے مگر تعجب یہ ہے کہ ہم نے انگریزی کے تابع کیا کہ جس کی بدولت اردو زبان قریب قریب اردو ہونے ہی سے نکل گئی اصل اردو زبان وہ ہے جیسے چہار درویش یا اردوی معلّٰی غالب کی اور اگر اس میں آمیزش ہو تو عربی کی آمیزش (۲) ہونی چاہیئے کہ عربی کی آمیزش لطف کو دوبالا

(۱) زبان میں خلط کر کے لفظ ''انا'' عربی کا اور ''بازار جاؤں'' اردو کا بولا (۲) ملاوٹ۔

کردیتی ہے۔ دیکھو فارسی کی عبارت میں اگر کہیں ایک جملہ عربی کا آجائے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گلفشانی ہوگئی ہو خلاصہ یہ ہے کہ ہماری زبان میں جو انگریزی کے خلط سے (۱) ایک جدت پیدا ہوگئی ہے وہ ضرور قابل ترک ہے اور اس جدید طرز میں علاوہ نقص مذکور کے ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ تلبیس (۲) زیادہ ہوسکتی ہے اور پرانے طرز میں یہ بات نہیں ہے اور ایک شرعی پہلو اس میں یہ بھی ہے کہ اس کو اختیار کرنا ایک فاسق قوم کے مشابہ ہونا ہے اور یہ مشابہت خود حرام ہے حدیث شریف میں ہے: ((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ))''جس نے کسی قوم کی صورت اختیار کی وہ انہیں میں سے ہے'' کیونکہ تشبیہ عام ہے لباس اور طرز سب چیزوں کو اور گو ممکن ہے کہ اس پر کوئی شخص مولویوں کو متعصب کہے لیکن ہم کو اس کی اصلاً پرواہ نہیں کیونکہ ہم ایک موقع پر ان کے مسلّم دلائل (۳) سے اسکا بُرا ہونا ثابت کرچکے ہیں باقی حدیث تو اپنے ماننے والوں کے لئے پڑھی ہے۔ اب میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ حدیث آپ پر بھی حجت ہے کیونکہ مسلمان تو آپ بھی ہیں۔

غرض اس وقت تقریرات میں یہ تمام خرابیاں پیدا کی گئی ہیں جن سے بسبب قواعد شرعیہ کے چھوڑ دینے کے ان تقریروں کا وجود کالعدم سمجھا جائیگا پس ثابت ہوگیا کہ جس طرح بیان کا وجود حسی موقوف ہے خلقِ انسان پر اسی طرح اس کا وجود شرعی موقوف ہے تعلیم قرآن پر اور یہی حاصل ہے ان آیات کا جن کی اس وقت تلاوت کی گئی اور چونکہ تقاریر میں آج کل یہ نقص عام طور سے پیدا ہوگیا ہے اس لئے یہ جی بھی چاہتا تھا کہ طریقہ بیان کے متعلق ایسی آیت اختیار کی جائے کہ قرآن ہی سے اس کی خرابیوں کا ناجائز ہونا بھی ثابت ہوجائے۔

---

(۱) انگریزی کے الفاظ شامل کرلینے سے (۲) حق و باطل کو ملا کر بیان کرنا (۳) اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی مرد زنانہ جوڑا پہن کر مردانے میں آبیٹھے اس کو معیوب کیوں سمجھا جاتا ہے اس نے بجز تشبہ کے کس جرم کا ارتکاب کیا ہے ۱۲ منہ۔

تقریر میں قابل اہتمام بات

سو بحمداللہ یہ آیت ملی کہ اسمیں تعلیم بیان کی شرط شرعی بھی مذکور ہے کہ قرآن سکھلایا کیونکہ غایت اس کی عمل ہے اور بیان میں اگر حدود وشرع کا لحاظ نہ رہا تو قرآن پر عمل نہ ہوا کیونکہ عمل بالقرآن کے فوت ہونے کے معنی یہی شریعت کا فوت ہونا ہے، کیونکہ قرآن مثل متن کے ہے اور سب علوم شرعیہ اسی کی شرح ہیں اور اسی کی مدلول ہیں کوئی عبارت النص سے کوئی اشارہ یا اقتضاء سے کوئی جزئیاً کوئی کلیاً۔

حدیث قرآن کا بیان ہے

چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت آئی اور کہنے لگی کہ میں نے سنا ہے کہ آپ بال نوچنے (۱) والی وغیرہا کو لعنت کرتے ہیں آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس کو قرآن لعنت کرے میں اس کو کیوں نہ لعنت کروں کہنے لگی میں نے تو تمام قرآن پڑھا اس میں تو یہ نہیں ہے آپ نے فرمایا: ((لَوْقَرَاتِيهِ لَوَجَدتِيهِ)) یعنی اگر خیال کر کے پڑھتی تو اس میں ملتا کیونکہ ان افعال کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور قرآن میں ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جو حکم دیں اس کو قبول کرو اور جس سے منع کریں رک جاؤ (۲) پس اس طرح یہ احکام بھی مدلول قرآن ہوگئے تو دیکھئے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو بھی قرآن ہی میں داخل فرماتے ہیں اور خود قرآن میں بھی ہے ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝﴾ ''جب ہم پڑھائیں تو آپ پیچھے پیچھے پڑھتے رہئے اس کے بعد اس کے بیان کر لینے کی ذمہ داری تو ہمارے اوپر ہے''

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اجمال کو بیان فرمایا اور اگر کہیں حدیث میں

---

(۱) یعنی جو حسن کے لئے پیشانی وغیرہ کے بال نوچ دے تاکہ پیشانی فراخ معلوم ہو ۱۲ منہ (۲) ﴿وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ سورۂ حشر: ۷

بھی خفا رہا تو اس کو حضرات مجتہدین نے ظاہر فرما دیا حتی کہ: (اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ) پوری طرح ظاہر ہوگیا اور اس ظہور اکمال کے بعد چونکہ پھر کوئی حاجت باقی نہیں رہی اور بحکمت الٰہیہ چوتھی صدی کے بعد قوت اجتہادیہ کا بھی خاتمہ ہوگیا کیونکہ اب اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ خدا تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے اس کو پیدا کر دیتے ہیں اور جب ضرورت پوری ہو جاتی ہے وہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا جب وہ پیدا ہو چکے تو ان کی پسلی سے حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا کیا جب ایک مرد و عورت ہو گئے تو وہ طریقہ بند کر دیا گیا اور زن وشو[۱] کے تعلق سے سب لوگ پیدا ہونے لگے۔ رہا حضرت عیسی علیہ السلام کا پیدا ہونا وہ خرق عادت کے طور پر ہے علی ہذا اور امور میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

شجر کاری کے فوائد

چنانچہ میں نے اخبار میں ایک ڈاکٹر کا قول دیکھا ہے وہ لکھتا ہے کہ بارش اس لئے کم ہوتی ہے کہ درخت کٹ کٹ کر کم رہ گئے ہیں تو بارش کثرت سے ہونے کی صورت یہ ہے کہ جہاں جہاں درخت کم ہیں بہت کثرت سے درخت لگائے جائیں۔ اس ڈاکٹر نے تو خدا جانے اس کی وجہ کیا سمجھی ہوگی لیکن راز اس میں یہی ہے کہ جب درخت نہ رہے تو بارش کی زیادہ ضرورت نہ رہی اور جہاں درخت بکثرت ہیں وہاں بارش کی بھی ضرورت زیادہ ہوتی ہے رہی زراعت کی ضرورت اس کا کام نہروں سے نکالنے لگے ہیں تو بارش سے اس کا بھی کم تعلق ہوگیا غرض فلسفہ بھی اس کو مانتا ہے اور ہم تو مانتے ہی ہیں: ﴿وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَاسَاَلْتُمُوْہُ﴾[۲] ''جو کچھ تم نے مانگا ہم نے دیا'' بھی اسی طرف مشیر ہے تو اسی طرح جب تک حضرات مجتہدین کی ضرورت تھی اجتہادی قوت پیدا ہوتی رہی اور جب یہ ضرورت

(۱) میاں بیوی (۲) ''اور جو جو چیز تم مانگی تم کو ہر چیز دی'' سورۂ ابراہیم: ۳۴۔

پوری ہو چکی یہ قوت بھی ختم ہو گئی۔

عجیب وغریب قوتِ حافظہ

علیٰ ہذا قوتِ حافظہ کی جس زمانے تک ضرورت تھی اس وقت تک علی وجہ الکمال یہ قوت عطا ہوتی تھی حتی کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو سو شعر کا قصیدہ ایک دفعہ سنکر یاد ہو جاتا تھا۔ حضرت امام ترمذی علیہ الرحمۃ جب نابینا ہو گئے تو ایک مرتبہ آپ کو سفر کا اتفاق ہوا راستہ میں ایک مقام پر پہنچ کر آپ نے اونٹ پر بیٹھے بیٹھے سر جھکا لیا۔ جمّال(۱) نے اس کا سبب پوچھا' تو آپ نے فرمایا کہ یہاں ایک درخت ہے اس میں ٹکر لگتی ہے' جمّال نے کہا کہ یہاں تو کوئی درخت نہیں ہے آپ نے اونٹ کو وہیں رکوا دیا اور فرمایا کہ اگر میرا حافظہ اس قدر کمزور ہو گیا ہے تو میں آج سے حدیث بیان کرنا چھوڑ دوں گا اور قریب کے گاؤں میں اول بھیج کر دریافت کیا اکثر لوگوں نے وہاں درخت ہونے سے انکار کیا لیکن گاؤں کے بعض بوڑھوں نے کہا کہ مدت گذری جب یہاں ایک درخت تھا اور تقریباً بارہ برس ہوئے کہ اس کو کاٹ دیا گیا ہے جب اس کی تصدیق ہو گئی تو آپ آگے بڑھے۔

اسی طرح ابوداؤد میں قصہ ہے ایک راوی بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک اعرابی سے ایک حدیث سنی تھی مدت کے بعد مجھے خیال ہوا کہ اس کے حافظے کا امتحان کرنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ اس نے غلط حدیث مجھ سے بیان کر دی ہو چنانچہ یہ راوی اس کے پاس گئے اور جا کر وہ حدیث پوچھی' اس نے وہ حدیث بتلائی اور کہا کہ تم میرا امتحان کرتے ہو میرا حافظہ اس قدر قوی ہے کہ میں نے ستر حج کئے ہیں اور ہر سال نئے اونٹ پر حج کیا اور مجھ کو یاد ہے کہ فلاں سال فلاں اونٹ پر حج کیا تھا۔

(۱) اونٹ چلانے والے نے اس کی وجہ پوچھی۔

امام بخاریؒ کسی مقام پر تشریف لے گئے وہاں کے عالموں نے آپ کا امتحان کرنا چاہا اور سو حدیثیں الٹ پلٹ کر کے آپ کے سامنے پڑھیں آپ ہر حدیث پر لَاۤ اَعْـــرِفُ (۱) فرماتے رہے جب وہ لوگ ختم کر چکے تو آپ نے اُن سب احادیث کو جو انہوں نے سنائی تھیں اسی طرح نقل فرمایا اور ساتھ ساتھ تصحیح کرتے گئے کہ اما الحدیث الاول فھو کذا واما الثانی فھو کذا(۲)۔ مگر جب حدیثیں مدون (۳) ہوگئیں اور ضرورت اس قدر حافظے کی نہ رہی تو قوت حافظہ کم ہونا شروع ہوگئی۔

مجتہدین کے اجتہاد کا مرتبہ

غرض انقطاع اجتہاد بعد ظہور اکمال دین کے ہوا ہے (۴) اور اجتہاد سے اکمال کے ظہور کا یہی حاصل ہے کہ ان کا قیاس بھی مثل حدیث مُبَیِّن قرآن و نیز مُبَیِّن حدیث ہے (۵) پس مجتہدین کے قیاسات یا حضور ﷺ کے ارشادات یہ سب علومِ قرآنیہ ہیں لہذا علم القرآن سے علم الشریعہ مراد ہوگا اور قرآن کا ترک شریعت کا ترک ہوگا۔

اس پر استدلال کرنے کے لئے اور بھی زیادہ صاف ایک واقعہ یاد آیا حضور ﷺ نے ایک مقدمہ کے متعلق فرمایا تھا: ((اَقْضِی بَیْنَکُمَا بِکِتٰبِ اللّٰہِ)) (۶) اور پھر وہ فیصلہ حدیث کے موافق تھا۔ خلاصہ سب کا یہ ہوا کہ قرآن کے موافق بیان وہ ہوگا جو کہ شریعت کے موافق ہو اور بیان میں تقریر اور تحریر دونوں داخل ہیں

(۱) میں نہیں جانتا (۲) کہ پہلی حدیث جو آپ نے پڑھی یہ تھی جو غلط ہے اور صحیح اس طرح ہے اور دوسری اس طرح (۳) باقاعدہ کتابوں میں لکھدی گئیں (۴) دین کی تکمیل ہونے کے بعد قوت اجتہادیہ منقطع ہوئی (۵) مجتہدین کا اجتہاد قرآن و حدیث کو بیان کرنے والا ہے (۶) میں تمہارے درمیان کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا۔

چنانچہ اسی تعلق کے اعتبار سے قرآن شریف میں ایک مقام پر ارشاد ہے: ﴿عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ﴾ (۱) یعنی بیان کبھی تو بیان بالقلم ہوتا ہے اور کبھی باللسان (۲) یہ دونوں قسمیں بیان ہی کی ہیں۔

نعمتِ عظمیٰ

اور اس بیان کا نعمت ہونا منافع دنیوی کے اعتبار سے بھی ہے لیکن اس وقت ان کا ذکر نہیں اس وقت خاص منافع دین کا ذکر ہے جن کے اعتبار سے یہ بیان ایک بڑی نعمت دینیہ بھی ہے اور وہ یہ ہیں کہ آج ہم لوگوں میں جو علم موجود ہے کہ اس کی بدولت ہم خدا تعالیٰ کے مقبول بندوں میں داخل ہوسکتے ہیں یہ نعمت بیانیہ ہی کی بدولت ہے کیونکہ اگر ہمارے حضرات سلف صالحین علوم کو مبیَّن و مدوّن (۳) نہ کر جاتے تو ہم کو کچھ بھی خبر نہیں ہوسکتی تھی۔ اسی طرح اگر ہم نفع متعدی کا ثواب حاصل کرنا چاہیں تو اس کی بھی یہی صورت ہے کہ ہم تحریر و تقریر میں پوری مہارت پیدا کریں اور علوم دینیہ دوسروں کو پہنچائیں ہم نے بعضے ایسے اہل علم بھی دیکھے ہیں کہ جن کو تحریر و تقریر نہیں آتی سوان سے بہت کم لوگوں کو نفع پہنچ سکتا ہے۔

تقریر وعظ کی اہمیت

اور پھر بہ نسبت تحریر کے تقریر میں مہارت پیدا کرنے کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ تحریر سے تو نفع خاص ہوتا ہے یعنی صرف طلباء اور خواندہ لوگوں کو اور تقریر میں نفع عام ہے جن میں خاص بھی داخل ہیں تو نفع عام و خاص کے اعتبار سے زبان سے بیان کی دو صورتیں ہیں ایک درس جس کا نفع خاص طلباء کو ہے اور ایک وعظ جس کا

(۱) ''قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا اور وہ سکھایا انسان کو جو اس کو معلوم نہ تھا'' سورۂ علق: ۴،۵ (۲) بیان کبھی زبان سے ہوتا ہے کبھی تحریر سے (۸) مرتب اور بیان نہ کرتے۔

نفع عوام کو ہے اور ان دونوں کا افادہ اس پر موقوف ہے کہ قوت بیانیہ بقدرِ ضرورت حاصل ہو پس ہمارے طلباء کو اس وقت ان دونوں کی تکمیل اور مشق کی ضرورت ہوئی یعنی جب وعظ کہا جائے تو اس طرح کہا جائے کہ عوام الناس پوری طرح سمجھ جائیں اور جب درس دیا جائے تو اس طرح کہ طلباء مخاطبین اس کو خوب سمجھ لیں۔

تدریس، تقریر اور تحریر سکھانے کا طریقہ

پھر درسیات میں دو قسم کی کتابیں ہیں ایک تو محض آلیات اور دوسری مقاصد، آلیات کا خطاب تو بالکل ہی خاص ہوتا ہے کیونکہ اس کو محض طلباء ہی پڑھتے اور سمجھتے ہیں اور مقاصد کا خطاب عام بھی ہوتا ہے اور خاص بھی یعنی قرآن وحدیث طلباء کے سامنے بھی پیش کیا جاتا ہے اور عوام الناس کے سامنے بھی، پس مشق میں بھی اس کی رعایت کی جائے یعنی جو لوگ صرف آلیات میں مشغول ہیں ان سے تو جلسۂ مشق میں صرف اس قسم کی تقریر کرائی جائے کہ وہ اول کتاب کی عبارت پڑھیں اور پھر اس کے مضامین کو حل کر دیں اس سے زیادہ توسیع نہ کریں (۱) اس میں علاوہ صفائی تقریر کے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ان کو پڑھانے کا طریقہ معلوم ہوگا ہمارے بزرگوں کا طریقہ پڑھانے کا یہی تھا کہ حضرات محض کتابوں کو حل

(۱) کیونکہ ایسے مبتدیوں کو کوئی خاص مضمون دینے میں جس کو وہ بطور وعظ کے بیان کریں چند خرابیاں ہیں اول تو وہ ان مضامین کو بوجہ قلتِ معلومات صحیح بیان نہیں کر سکتے سو اگر اصلاح کی جائے کہاں تک کی جائے اگر نہ کی جائے تو وہ بھی جہل میں مبتلا رہیں گے اور سامعین بھی غلطی میں پڑینگے، دوسرے وہ اپنے اسباق کو چھوڑ کر شب وروز ان ہی مضامین کے جمع کرنے کی فکر میں رہیں گے تیسرے اگر ان کی کتابیں رہ گئیں تو مشاق ہونے کے سبب وہ وعظ کا پیشہ اختیار کریں گے اور جاہل واعظ ہو کر خلق کو خراب کریں گے اور جس طرح ایسے مبتدیوں کو تقریر میں توسیع مضر ہے اسی طرح تحریر میں بھی جیسے اسوقت اس کی بھی عادت ہوگئی ہے کہ ایسے لوگ بھی اخباروں میں مضمون بھیجتے ہیں۔ ۱۲ منہ

فرما دیتے تھے اور زائد کچھ نہ بتلاتے تھے ہاں اگر کوئی بہت ہی ضروری بات ہوتی تو اس کو فرما دیتے تھے اور پڑھانے میں ایک اس امر کی بھی رعایت ضروری ہے کہ جو بات معلوم نہ ہو تو اس کو صاف صاف کہدے یہ طریقہ حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ سے موروث (۱) چلا آتا ہے اس طریق میں یہ نفع ہے کہ طالب علم کو مدرس پر ہمیشہ وثوق (۲) رہتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مجھے جو کچھ بتلایا جارہا ہے سب صحیح ہے اور جہاں اس طریقے پر عمل نہیں کیا جاتا بلکہ بات کو بنایا جاتا ہے اور اکثر طالب علم ان کی ہٹ دھرمی کو سمجھ جاتے ہیں تو وہاں مصیبت ہوتی ہے جھک جھک میں سبق بھی خراب ہوتا ہے اور یہی بدخلقی طالب علم بھی سیکھتا ہے۔ بعضے لوگ کہتے ہیں کہ اس اقرار غلطی سے طالب علم بگڑ جاتا ہے حالانکہ محض لغویات ہے وہ اور زیادہ سنور جاتا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ اس کو مدرس پر وثوق ہو جاتا ہے۔

غرض یہ ہے طرزِ درس، تو تقریر کے وقت بھی اس کا خیال رکھیں اور تحقیقات و زیادات کو بالکل حذف کریں کیونکہ یہ تقریریں صرف پڑھانے کا طریقہ بتلانے کے لئے کرائی جائیں گی طبیعت کی جولانیاں دکھلانے کے لئے نہیں اور جو درس کے وقت ایسی فضولیات بیان کی جاتی ہیں وہ اس لئے بھی مفید نہیں کہ کسی کو بھی یاد نہیں رہتیں اور اضاعت وقت کا ضرر جدا (۳)۔

تدریس کا بہترین انداز

جیسے مولوی محمد صدیق صاحب مرحوم گنگوہی کہتے تھے کہ میں دہلی میں جب مدرس ہو کر گیا تو ولایتی طالب علم میرے سپرد ہوئے اور سُلّم (۴) شروع ہوئی

---

(۱) وراثت میں چلا آتا ہے (۲) اعتماد رہتا ہے (۳) وقت کے ضائع ہونے کا نقصان اس کے علاوہ (۴) منطق کی کتاب۔

میں نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ تحقیق سے پڑھو گے یا سیدھا سادہ؟ کہنے لگے کہ ہم تو تحقیق سے پڑھیں گے۔ میں نے رات کو بہت سے حواشی اور شروح دیکھ کر صبح کو نہایت تحقیق سے پڑھایا جب دوسرا دن ہوا اور پھر میں نے یہی سوال کیا' طلباء نے پھر یہی کہا کہ ہم تو تحقیق سے پڑھیں گے میں نے کہا کہ اگر تحقیق سے پڑھو گے تو کل جو کچھ میں نے تم کو بتلایا تھا اس کا اعادہ کر دو تا کہ مجھے یہ اندازہ ہو کہ تم میں قابلیت تحقیق سے پڑھنے کی ہے یا نہیں' یہ سن کر سب کے سب میرا منہ تکنے لگے اور ایک سے بھی اعادہ نہ ہوسکا اس وقت میں نے کہا کہ سنو! تم نے باوجود یکہ مجھ سے یہ تقریریں سنیں اور بیان نہ ہوسکا اور میں نے باوجود اس کے کہ استاد نے اس مقام پر مجھ کو درس کے وقت یہ تقریریں نہیں بتلائیں اور میں نے بیان کر دیں آخر اس کا کیا سبب ہے؟ معلوم ہوا کہ استعداد کی ضرورت ہے جو کتاب سے پیدا ہوتی ہے ان تقریروں سے کچھ نہیں ہوتا سو کتاب پڑھو' تب وہ سمجھے اور حلِ کتاب پر کفایت کی'

غرض یہ ہے کہ مدرس کے لئے لیکچر کا طرز بہت مضر ہے۔ میں نے ایک طالب علم کو دیکھا کہ وہ ایک مبتدی کو میزان پڑھا رہے تھے اور اس کے خطبے میں الف لام تعریف کی قسمیں بیان کر رہے تھے میں نے کہا کہ مولوی صاحب اس غریب کا کیوں راہ مار رہے [1] ہو یہ ان سب مضامین کو جزوِ میزان سمجھے گا اور مشکل سمجھ کر میزان ہی کو چھوڑ دیگا۔

---

(۱) کیوں نقصان کرتے ہو۔

حضرت تھانویؒ کا اندازِ تدریس

میں نے اپنے پڑھانے کا طرز ہمیشہ یہی رکھا کہ نفس کتاب کو حل کر دیا اور زوائد کبھی بیان نہیں کئے اور حل بھی اس طرز سے کہ بڑے بڑے مشکل مقامات بھی کبھی طالب علموں کو مشکل نہیں معلوم ہوئے۔ صدرا(۱) میں مثناۃ بالتکریر کی بحث ایک مشہور بحث ہے۔ کانپور میں ایک مولوی فضلِ حق طالب علم مجھ سے صدرا پڑھتے تھے جس دن یہ مقام آیا ہے تو میں نے بلا اہتمام معمولی طور سے اس کی تقریر کر دی جب انہوں نے اس کو اچھی طرح سمجھ لیا تو میں نے یہ کہا کہ یہ ہی مقام ہے جو مثناۃ بالتکریر کے لقب سے مشہور ہے ان کو بڑا تعجب ہوا اور کہنے لگے کہ یہ تو کچھ بھی مشکل نہیں آخر سالانہ امتحان میں ممتحن نے یہی مقام سوال میں دیا مولوی فضلِ حق صاحب مرحوم نے اس مقام کی جو تقریر لکھی تھی (کہ وہ اب تک مدرسۂ جامع العلوم میں محفوظ ہے) ممتحنین بھی اس پر عش عش کرتے تھے بعض نے یہ کہا کہ ہم نے اس مقام کی تقریر ایسی کبھی نہیں دیکھی ۔تو بڑی کوشش اس کی ہونی چاہیئے کہ کتاب کو پانی کر دے نہ یہ کہ اپنی فضیلت کا اظہار کرے۔ یہ تو تقریر آلیات کا طرز ہے۔

تقریر کا بہترین طریقہ

اب رہے مقاصد یعنی علوم دینیہ سو ان کو چونکہ کبھی عوام کے سامنے بیان کرنے کی نوبت آتی ہے اور کبھی خواص کو خطاب ہوتا ہے اس لئے اس کے متعلق دونوں طرز کی مشق ہونی چاہیئے اور اس کی دو صورتیں ہیں یا تو ہر جلسے میں

(۱) کتاب کا نام ہے۔

نصف وقت طرز خاص اور نصف وقت طرز عام کے لئے رکھا جائے یا یہ کیا جائے کہ ایک باری میں طرز خاص کے موافق تقریر ہو اور دوسری باری میں طرز عام کے موافق تقریر ہو۔

وعظ کا نام

اب بحمداللہ سب ضروری باتیں اس کے متعلق ہوگئیں صرف یہ بات رہی کہ اس جلسے کا نام کیا رکھا جائے سو میرے خیال میں ''تعلیم البیان'' اس کا نام بہتر ہے۔

نام رکھنے میں احتیاط کی ضرورت

آجکل لوگوں کو ایک یہ خبط بھی بہت بڑھا ہوا ہے کہ جب کوئی کام شروع کریں تو اس کے لئے نام بھی کوئی نیا اور نرالا تجویز کریں۔ اسی خبط کی بدولت ندوہ کو ایک بڑی لغزش ہوئی یعنی نیا نام تلاش کرنے کی وجہ سے علماء کی مجلس کا نام ندوہ تجویز کیا گیا جو کہ راس الجہال عدواللہ ابوجہل (۱) کی اس مجلس کا نام تھا جس کی بنیاد محض اس لئے قائم ہوئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی ضرر رسانی (۲) اور آپ کے دین کی اشاعت روکنے کی تدابیر پر غور کیا جائے اور عجب نہیں کہ اسی نام کا اثر ہو کہ آج یہ پاکیزہ نور ندوے میں برس رہا ہے۔

طرزِ جدید کا نقصان

اب بہتر معلوم ہوتا ہے کہ غرض بیان کے متعلق ایک حدیث بھی بیان کردی جائے حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ((مَنْ تَعَلَّمَ صَرْفَ الْكَلَامِ لِيَسْبِيَ بِهِ

(۱) جاہلوں کے سردار اللہ کے دشمن ابوجہل (۲) تکلیف دینے۔

قُلُوبَ الرِّجَالِ اَوِ النَّاسِ لَمْ یَقْبَلِ اللّٰهُ مِنْهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ صَرْفًا وَّلَا عَدْلًا))
دیکھئے اس وقت نہ کوئی اس قسم کی انجمن تھی نہ مجالس کا یہ طرز تھا لیکن حضور ﷺ نے اس کا انتظام بھی اسی وقت فرمادیا کہ ''جو شخص کلام کے ہیر پھیر کو اس لئے سیکھے کہ اس کے ذریعے سے لوگوں کے قلوب کو مسخر کریگا تو خدا تعالیٰ اس سے قیامت کے دن کسی نفل و فرض کو قبول نہ فرمائینگے'' یہ حدیث فساد غرض پر متنبہ کرنے کے لئے بہت کافی ہے اور اس سے ﴿عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ﴾ پر ﴿عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ﴾ کو مقدم کرنے کی غرض اور زیادہ وضاحت سے ہوگئی جس کا اوپر بھی بیان ہوا ہے۔ میں ان طالب علموں کو چونکانا چاہتا ہوں جو آج کل طرز جدید کو تقریر میں اختیار کرتے ہیں جس کی غرض زیادہ تر یہی ہے کہ جاہ اور وقعت اور قبول عام ہو اسی لئے یہ کوشش ہوتی ہے کہ الفاظ پُرشوکت ہوں بندشیں چست ہوں حالانکہ اس سے خاک بھی نہیں ہوتا۔ اس قسم کی تقریروں کی ہستی صرف اتنی ہوتی ہے کہ جیسے مشہور ہے کہ ایک منہار(۱) چوڑی کی پوٹ لئے جاتا تھا ایک گنوار نے اس میں لاٹھی مار کر پوچھا کہ اس میں کیا ہے کہنے لگا کہ ایک اور ماردو تو کچھ بھی نہیں۔ برخلاف پرانی تقریروں کے کہ اگر ان پر پچاس چوٹیں بھی ماریں تو وہ اپنی اسی حالت پر قائم ہیں ان کی قوت میں ذرا بھی تزلزل نہیں ہوتا۔

تقریر میں بے باکی ناپسندیدہ ہے

بلکہ حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت بے باکی اور آزادی سے تقریر کرنا بھی مذموم ہے چنانچہ حدث میں ہے: ((اَلْحَیَآءُ وَالْعِیُّ شُعْبَتَانِ مِنَ

(۱) چوڑیاں بنانے اور بیچنے والا۔

الْاِیْمَانِ وَالبَذَآءُ وَالْبَیَانُ شُعْبَتَانِ مِنَ النِّفَاقِ)) اس حدیث میں حضور ﷺ نے حیاء کو بذاء کے مقابلے میں اور عی کو بیان کے مقابلے میں فرمایا ہے اور حیا اور عی کو ایک ساتھ جمع کر کے ایمان کے شعبوں میں سے قرار دیا ہے اور بذاء اور بیان کو نفاق کے شعبے قرار دیئے ہیں اس قرینے سے معلوم ہوا کہ عی سے وہ عی مراد ہے جو کہ حیا کی وجہ سے ہو اور حیا فی نفسہٖ عام ہے خواہ حیا من الخلق ہو خواہ من الخالق (۱) مگر اس مقام پر مقصود حیا من اللہ ہے یعنی ہر لفظ پر یہ سوچ کہ کہیں شریعت کے خلاف کوئی بات نہ نکل جائے اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو بیان حدود شرعیہ سے متجاوز ہو وہ ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ میں داخل نہیں کیونکہ وہ بیان جس کا آیت میں ذکر ہے نعمت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اور حدیث میں ایسے بیان کو جس کا منشاء بذاء ہو نفاق میں داخل فرمایا ہے اور قرآن و حدیث میں تعارض ہو نہیں سکتا پس معلوم ہوا کہ جو بیان مذموم ہے وہ نعمت نہیں لہذا ایسے بیان سے بچنے کی کوشش نہایت ضروری ہے۔

اب خدا تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ وہ ہر امر میں اتباع کی توفیق عطا فرمائیں۔ (۲)

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی سیّدنا ومولانا محمّد وّعلٰی
آلہ واصحابہ وبارك وسلم
وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

(۱) خواہ مخلوق کی حیاء ہو یا خالق کی (۲) اللہ تعالیٰ محشی کو بھی قول و بیان حق و صحیح کی ہمت و توفیق عطا فرمائیں آمین۔ خلیل احمد تھانوی

﴿ہر کام میں رضائے الٰہی پیشِ نظر ہو﴾

حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ہم تو عطر اس لئے لگاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو پسند آئے۔ ایک مرتبہ فرمایا جب پانی پیو ٹھنڈا پیو' ٹھنڈا پانی پینے سے بال بال سے الحمدللہ نکلتی ہے۔ سبحان اللہ ان حضرات کی نیت ہر امر میں یہی ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ راضی ہو اور شکر کامل ادا ہو۔ یہ ہر شخص سے نہیں ہوسکتا مثلاً کھانا کھانے' کپڑا پہننے' چلنے پھرنے' ہر کام میں یہی نیت ہو۔ یہ نیت فرض دائم نہیں مگر اتنا ضروری ہے کہ ہر کام میں یہ خیال کرے کہ یہ خلاف مرضی حق تعالیٰ تو نہیں ہے۔

غرض ہر کام اگر للرضاء نہ ہو مگر یہ خیال تو ضرور ہے کہ خلاف رضا نہ کروں یہ مرتبہ فرض دائم ہے۔

وعظ: التوجہ

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

ﷺ رضی اللہ عنہ رضی اللہ عنہم علیہ السلام